نظریے کی تخلیق اور ادب کے سماجی رشتے

ڈاکٹر زاہد منیر عامر
پروفیسر اردو، شعبہ اردو، اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

CREATION OF IDEALOGY AND SOCIETAL RELATIONS OF LITERATURE

Zahid Munir Amir, PhD
Professor of Urdu
Department of Urdu, University of the Punjab, Lahore

Abstract

This article sheds light upon the fact that creativity asks for freedom on both individual and macro levels. This freedom also demands ransom which both the individual and the nation have to pay. The friction formed by this crisis helps to create literature. Despite this price, literature has to maintain high moral values. The article further explains that man needs attitude of faith which makes him capable of winning a personality here and hereafter. It is only by rising to a fresh vision of his origin and future, that man eventually triumphs over a society motivated by an inhuman competition, and a civilization which has lost its spiritual unity by its inner conflict of religious and political values.

Keywords:

سلطنت عثمانیہ، تخلیق، اقبال، ایلیٹ بٹالین، شیکسپیر، ایڈورڈ سعید، پریم چند، روحانی، انسان

زندگی اوراس کی سچائیاں عام ہیں ان کا تجربہ بھی سب کومیسر ہے لیکن سب اپنے تجربات کے اظہار پر قادرنہیں ہوتے ۔زندگی کی سچائیاں جب کسی موزوں پیرایہءبیان میں ڈھل کر دل ودماغ پر اثر انداز ہونے کی صلاحیت پیدا کرلیتی ہیں تو ادب جنم لیتا ہے۔ضرور ہے کہ یہ ادب کسی اجتماع میں ظہور کرے۔جب ہم کسی اجتماع میں تخلیقِ ادب کی بات کرتے ہیں تو اس کے زمانی رشتے خودبخود واضح ہوجاتے ہیں یعنی اس اجتماع کا کوئی ماضی ہوگا وہ کسی لمحہءموجود سے گزر رہا ہوگا اوراس کے قدم کسی مستقبل کی جانب بڑھ رہے ہوں گے۔ہمیں ادب کومعاشرے اوراس کے زمانی رشتوں کے انھی دوائر میں پھیلا کر دیکھنے کی ضرورت ہے۔

ادب، زندگی کوتخلیقی زاویے سے دیکھنے کے نتیجے میں وجودپذیر ہوتا ہے،اس مقصد کے لیے تخلیق کار کی نگاہ کوارتکاز کی ضرورت ہوتی ہے،جس کی مدد سے وہ زندگی کے نامنکشف پہلوؤں کو منکشف کرسکتا ہے اوراپنے قاری کے لیےنشانِ راہ کا وجہ اختیار کرسکتا ہے۔تخلیق ادب کا سفر جہاں بہت سے مطالبے رکھتا ہے وہاں اس کے بہت سے تقاضے بھی ہیں ۔سب سے بڑا مطالبہ ارتکاز ہے جس کی جانب ہم نے اشارہ کیا ہے،عصر حاضر ملک الموت بن کر ذہن انسانی سے اس کی اسی قیمتی کیفیت کوچھین رہا ہے۔یہ دست برد کن سطحوں پراورکن ناموں سے ہورہی ہے انھیں نشان زد کرنے کی ضرورت ہے۔

وہ تخلیق کار جواس جنگ میں کام یاب ہوکر تخلیق فن کی منزل سر کرلیتا ہے اس کے سامنے مقابلےاورتحدیات کے کئی محاذ کھل جاتے ہیں اس لیے کہ سچا ادب 'سٹیٹس کو' کوایک خطرناک شے تصور کرتے ہوئے اسے توڑتا ہےاور یہ ایک دشوار عمل ہے۔شاید یہ عمل تخلیق کار ہی سے خاص نہیں بل کہ معاشرے کے ہر باشعورفرد سے زندگی کے قافلے کوآگے بڑھانے کی توقع کی جاتی ہے کہ ''ہر کس نگہی دارد ہر کس سخنی دارد''اوراسی کے نتیجے میں ارتقاجنم لیتا ہے۔زندگی کی موجودصورت کوعلیٰ حالہ قبول کرلینے سے ارتقاممکن ہوتا ہے نہ ترقی،اس لیے ضروری ہے کہ موجود کوسوال کے دائرے میں لایا جائے،سطح سے اترکر تہ میں دیکھنے کی طرح ڈالی جائے،سچائی کی تلاش اورجستجو کوشیوہ بنایا جائے۔یہ عمل

ہر زندہ وجود کے لیے ہر مرحلہ عمر پر ضروری ہے۔ایک ادیب یا دانش ور کی ذمہ داری اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ وہ صرف سچائی ہی کی بقا و ابلاغ کا ذمہ دار نہیں بل کہ ناوم چومسکی کے بہ قول نظریے کی تخلیق اور تجزیے کی ذمہ داری بھی اسی پر عاید ہوتی ہے۔ (۱)

سچائی سے آشنا ہونا ایک مرحلہ ہے اور اس کا اظہار دوسرا۔ایک ادیب کے لیے سچائی سے آشنا ہونا ہی کافی نہیں اس کے زبان و قلم سے سچ کا ظہور بھی تخلیق فن کا ایک مرحلہ ہے اور یہ مرحلہ اتنا آسان نہیں جتنا کہ بہ ظاہر دکھائی دیتا ہے۔تاریخ بتاتی ہے کہ ہر دور میں سچائی کی قیمت کا مطالبہ کرنے والی قوتیں پکار پکار کر ھل من مزید کہتی سنائی دیتی ہیں۔

ادب، شعور نو کا داعی بن کر آگے بڑھتا ہے تو زمانہ زہر بھرا جام ہاتھوں پہ سجائے آموجود ہوتا ہے۔ یہ سلسلہ عہدِ سقراط سے خاص نہیں، یہ زہر ہر زمانے کی طرح آج بھی پینا پڑتا ہے۔فرق صرف معاشروں، حالات اور دورِ زمان کا ہوتا ہے۔سزا معاشرے کی نوعیت اور ہیئت کے مطابق ہوتی ہے۔ برژنیف کے دور میں اختلاف رائے کی سزا معزولی یا جلاوطنی ہوا کرتی تھی، ایل سلواڈور میں سرکشوں کو ہول ناک جسمانی اذیت کا نشانہ بنانے کے بعد ٹکڑے ٹکڑے کر کے کسی کھائی میں پھینک دینا مناسب خیال کیا جاتا تھا یا کسی تربیت یافتہ ایلیٹ بٹالین کے حوالے کر دیا جاتا تھا جو مار مار کر ان کا بھرکس نکال دیتی۔سیاہ فام آبادی کی کچی بستیوں میں سرکشی کی سزا بھی اس سے کچھ کم بدصورت نہیں رہی۔ (۲)

سچائی اور آزادی بہنوں کی طرح ہیں شعلہ تخلیق کی لپک آزادی چاہتی ہے، افراد کی آزادی، اقوام کی آزادی۔سچائی کی طرح آزادی بھی مہنگا سودا ہے، یہ قیمت افراد ہی کو نہیں اقوام کو بھی اسی طرح ادا کرنا ہوتی ہے۔ ہیٹی نے فرانس سے آزادی حاصل کرنے کے جرم میں کتنا بھاری جرمانہ ادا کیا، انڈونیشیا کو ولندیزی محسنوں کے استبدادی پنجے سے نجات پر کیسا تاوان ادا کرنا پڑا، ظلم و ستم برپا کر لینے کے بعد طاقت ور اپنی کارروائیوں کا خرچ یا لاگت بھی وصول کرتا ہے اس کے علاوہ بدمعاشی کے خلاف ردعمل کو سختی سے دبا دینا بھی معیاری استعماری طریق کار کا ایک اہم حصہ ہے۔(۳) یاد کیجیے پہلی جنگ عظیم کے بعد معاہدہ سیورے کی وہ شرائط جن میں سلطنت عثمانیہ کی آزادی و خودمختاری چھینی گئی اس کا

جغرافیہ بدلا گیا، اسی پر بس نہیں بل کہ اس سے اپنی جارحیت کا تاوان بھی طلب کیا گیا تھا۔ تاریخ کا سبق یہی ہے کہ معاشرے اور قانون اسی کے ہوتے ہیں جس کے ہاتھ میں طاقت ہوتی ہے۔

ایسے میں ایک تخلیق کار کے لیے جو سماج کے چند در چند رشتوں اور مجبوریوں میں بندھا ہوتا ہے سچ یا تخلیقی سرگرمی کی پاسداری کے مطالبات پورے کرنا آسان بات نہیں اسی لیے عصری منظر نامے میں ادیب کا کوئی کردار دکھائی نہیں دیتا بل کہ اگر عصری مسائل کی نسبت ادیب کی رائے دریافت کی جاتی ہے تو وہ یا تو صورت حال کی پیچیدگی سے بے خبر ہوتا ہے یا اس پر اظہار خیال سے گریز کرتا ہے۔ ایڈورڈ سعید نے اپنے واحد دورۂ ہندوستان میں جامعہ ملیہ کے اسپیشل کانووکیشن سے خطاب کرتے ہوئے اپنا ایک تجربہ بیان کیا تھا کہ 'ویت نام کی جنگ کے زمانے میں جب شمالی ویت نام لاؤس اور کمبوڈیا پر ہزار ہا ٹن بم گرائے جا رہے تھے تو ایک طالب علم ایک محضر نامے پر دستخط کروانا پھر رہا تھا جس میں کہا گیا تھا کہ بی ۵۲ بمبار جہازوں سے ساٹھ ہزار فٹ کی بلندی سے بے گناہ لوگوں پر بمباری کا اقدام جہاں سے پائلٹ کو نیچے کی حالت کا بھی کچھ اندازہ نہیں ہوتا کہ زمین پر کیا گزر رہی ہوگی اور جس کے نتیجے میں بچے، عورتیں، غریب لوگ اور کسان ملیا میٹ ہو رہے ہوں غیر منصفانہ ہے۔ اس محضر پر دستخوں کے مطالبے کے جواب میں ایک ساتھی نے کہا کہ میں ادب کا پروفیسر ہوں میں شیکسپیر اور ملٹن کے بارے میں لکھتا ہوں میرا بمباری سے کوئی لینا دینا نہیں ہے اس لیے میں اس پر دستخط نہیں کروں گا..... یہ میرا میدان نہیں ہے میں اس میں کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ (۴) اس رویے پر ایڈورڈ سعید نے تو جو ملامت کی سو کی آپ ذرا گردن جھکا کر دیکھ لیجیے کہ ہم میں سے کتنے ادیب، شاعر اور دانش ور ہیں جو اس قسم کی صورت حال پر تنقید نہیں محض اظہار خیال ہی کی ہمت رکھتے ہوں؟

اس طرز عمل کا نتیجہ لازمی طور پر پست معیاروں سے مفاہمت کی صورت میں نکلتا ہے۔ پست معیار، پست تخلیقی تجربے کو جنم دے سکتے ہیں اور پست تخلیقی تجربہ زندگی کو بلند معیاروں اور تصورات سے آشنا نہیں کر سکتا۔ اس سربلندی کے لیے زندگی کے ایسے تصور کی ضرورت ہے جو تخلیق کاروں کی نگاہوں پر بلند خوابوں کا نزول کر سکے اور انھیں عصری زندگی کی الجھنوں اور مشکلوں سے بے نیاز نہ ہونے دے۔

ادب کی دنیا میں عملی زندگی کے مسائل سے ادب اور ادیب کی وابستگی کے حوالے سے ہمارا ذہن فوری طور پر ترقی پسند تحریک کے تجربے کی جانب جاتا ہے۔ تاریخ کے دامن میں اتر کر دیکھیں تو ترقی پسند تحریک کے تاسیسی اجلاس میں پیش کیا جانے والا خطبۂ صدارت جب اس تحریک کی بوطیقا ترتیب دے رہا تھا تو پریم چند کی نگاہ بار بار ایک شاعر کی جانب اٹھتی تھی جو سمندر میں رہتے ہوئے سکون کی تلاش کو باعثِ ننگ خیال کرتا ہے، جس کے نزدیک زندگی کا راز تپش اور تڑپ میں پوشیدہ ہے جو آشیان نشینی پر لذتِ پرواز کو ترجیح دیتا ہے۔ وہ اس قوتِ عمل کے قائل ہیں جس کی جانب اقبال نے متوجہ کیا اور آرٹ کا وہ تصور جس میں آرٹ 'اگر خودی کی حفاظت کرے تو عین حیات، نہ کر سکے تو سراپا فسون و افسانہ' بن جاتا ہے۔ پریم چند کہتے ہیں ''اب تو ہمیں اس آرٹ کی ضرورت ہے جس میں عمل کا پیغام ہو اب تو حضرت اقبال کے ساتھ ہم بھی کہتے ہیں''(۵)

رمز حیات جوئی جز در طلب نیابی
درقلزم آرمیدن ننگ است آبجو را(۶)

یعنی اگر تمھیں زندگی کی رمز کی تلاش ہے تو یہ تپش/تڑپ کے سوا کہیں نہیں ملے گی، ندی کے لیے سمندر میں سکون پا جانا باعث ننگ ہے۔

بہ آشیان نہ نشینم ز لذت پرواز
گہی بشاخ گلم گاہ بر لب جویم(۷)

یعنی لذت پرواز مجھے پرسکون ہو کر آشیانے میں نہیں بیٹھنے دیتی، کبھی شاخ گل میرا نشیمن بنتی ہے تو کبھی ندی کا کنارا۔

صرف یہی نہیں ترقی پسند تحریک کے اس اولین اجلاس کا خطبۂ صدارت دیتے ہوئے منشی پریم چند یہ بھی کہتے ہیں کہ ''ہمارا آرٹ شادابیات کا شیدائی ہے اور نہیں جانتا شباب سینے پر ہاتھ رکھ کر شعر پڑھنے اور صنف نازک کی کج ادائیوں کے شکوے کرنے یا اس کی خود پسندیوں اور چونچلوں پر

سر دھننے میں نہیں ہے، شباب نام ہے آئیڈیلزم کا، ہمت کا، مشکل پسندی کا، قربانی کا، اسے تو اقبال کے ساتھ کہنا ہوگا (۸)

در دشت جنون من جبریل زبون صیدی
یزدان بکمند آور ای ہمت مردانہ(۹)

یعنی میرے دشت جنون میں جبرئیل جیسا عظیم فرشتہ معمولی شکار ہے، اے ہمت مردانہ اب تجھے خدا پر کمند ڈالنی چاہیے۔

یا

چو موج، سازِ وجودم ز سیل بی پرواست
گمان مبر کہ درین بحر ساحلی جویم(۱۰)

یعنی زندگی کے سمندر میں میرا وجود حوادث کا مرہون منت ہے جیسے بے پرواطوفان، موج کا سامان وجود ہوتا ہے، یہ گمان مت کر کہ میں اس طوفان میں ساحل/سکون کا خواہاں ہوں۔

اس سے آگے بڑھ کر زندگی اور ادب کے باہمی رشتوں کی تلاش کرتے ہوئے پریم چند کی نگاہ ایک بار پھر اقبال کی جانب اٹھتی ہے اور وہ کہتے ہیں "جو شخص سچا آرٹسٹ ہے خود پروری کی زندگی کا عاشق نہیں ہوسکتا، اسے اپنے قلب کے اطمینان کے لیے نمائش کی ضرورت نہیں اس سے تو اسے نفرت ہوتی ہے وہ تو اقبال کے ساتھ کہتا ہے: (۱۱)

مردِ آزادم و آن گونہ غیورم کہ مرا
می توان کشت بہ یک جامِ زلالِ دگران (۱۲)

پریم چند نے تو عارض محبوب میں گم ہو جانے والوں کی نصیحت کے لیے یہ شعر اقتباس کیا ہے جس غزل سے یہ شعر اقتباس کیا گیا اس قابل ہے کہ ناظرین کرام پوری غزل پر نگاہ ڈالیں اور دیکھیں کہ ایک ادیب اور دانش ور کا سماج سے کیا رشتہ ہوتا ہے :

مثل آئینہ مشو محو جمال دگران
از دل و دیدہ فروشوی خیال دگران
آتش از نالہء مرغان حرم گیر و بسوز
آشیانی کہ نہادی بہ نہال دگران
در جہان بال و پر خویش کشودن آموز
کہ پریدن نتوان با پر و بال دگران
مردِآزادم و آن گونہ غیورم کہ مرا
می توان کشت بیک جام زلال ِدگران
ای کہ نزدیک تر از جانی و پنہان زنگہ
ہجر تو خوشترم آید زوصال دگران(۱۳)

ترجمہ: آئینہ کی مانند دوسروں کے حسن میں محو نہ ہو دوسروں کی جانب نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھ بل کہ ان کا خیال اپنے دل اور نگاہوں سے محو کر دے۔

جس نے غیروں کے درخت پر آشیانہ استوار کر کھا ہے اسے چاہیے کہ نالہ ءمرغان حرم سن کر اغیار کی شاخون پر بنے آشیانے کو جلا دے۔

زمانے میں اپنے پر و بال کھولنا سیکھو کہ دوسروں کے دیے ہوئے بال و پر کی مدد سے اڑا نہیں جا سکتا

میں مرد آزاد ہوں اور اتنا غیور ہوں کہ دوسروں کے عطا کردہ ایک جام صافی کی مدد سے مجھے ختم کیا جا سکتا ہے

اے وہ ذات جو ہماری نگاہوں سے پوشیدہ لیکن روح سے قریب تر ہے مجھے آپ کا ہجر دوسروں کے وصال سے زیادہ پیارا ہے۔

آپ نے پریم چند کی زبان سے اقبال کے شعری خیالات سنے اب اقبال کی زبان سے ان

کی نثر بھی سن لیجیے جس میں ان کی آواز بالکل صاف سنائی دے رہی ہے اور وہ انسانی زندگی، عصر حاضر کے مسائل، فرد اور معاشرے کے ربط و تعلق پر بات کر رہے ہیں اور جس کے آئینے میں ہم ادب، ادیب اور معاشرے کے تعلق کو بھی سمجھ سکتے ہیں۔ انھوں نے اب سے ایک سو دس برس پہلے اپنے ایک مضمون میں عہد قدیم اور عہد جدید کے انسان کا موازنہ کرتے ہوئے کہا تھا:

''نظام قدرت کے وہ تمام قویٰ جن کے نا قابل تشریح عمل سے مرعوب ہو کر قدیم قومیں انھیں ربوبیت کے لباس سے مزین کر کے ان کے لیے عظیم الشان معابد تعمیر کیا کرتی تھیں موجودہ علوم کی وساطت سے انسان کے دست بستہ غلام ہیں اور یہ مظلوم و مجہول، اس عظیم الشان امانت کا بار اٹھائے جس کے اٹھانے سے پہاڑوں نے بھی انکار کر دیا تھا، اپنے اشرف المخلوقات ہونے پر بجا ناز کر رہا ہے۔ اس کی مستفسرانہ نگاہیں قدرت کے سربستہ رازوں کو کھول رہی ہیں اور اس کا دماغ ان ہی علمی فتوحات کے سہارے پہاڑوں، سمندروں، دریاؤں حتیٰ کہ چاند سورج اور ستاروں پر بھی حکومت کر رہا ہے۔ یہ ہے وہ حیرت انگیز تغیر جو زمانہ حال کو زمانہ ماضی سے متمیز کرتا ہے اور جس کی حقیقت اس امر کی متقاضی ہے کہ تمام قومیں جدید روحانی اور جسمانی ضروریات کے پیدا ہو جانے کی وجہ سے اپنی زندگی کے لیے نئے سامان بہم پہنچائیں''۔(۱۴)

جدید روحانی اور جسمانی ضروریات کے لیے کس فکری غذا کی ضرورت ہے اقبال نے اسے بھی کھول کر بیان کر دیا ہے۔ ضرورت صرف اس کی آواز سننے اور اسے سمجھنے کی ہے۔ دیکھیے *Reconstruction of Religious Thought in Islam* کے آخری خطبے ''کیا مذہب کا امکان ہے'' میں کس وضاحت سے کہا ہے: ''جس مایوسی اور دل گرفتگی میں آج کل کی دنیا گرفتار ہے اور جس کے زیر اثر انسانی تہذیب کو ایک زبردست خطرہ لاحق ہے اس کا علاج نہ تو عہد وسطیٰ کی صوفیانہ تحریک سے ہو سکتا ہے اور نہ جدید زمانے کی وطنی قومیت اور لادینی اشتراکیت کی تحریکوں سے اس وقت دنیا کو حیاتِ نو کی ضرورت ہے، اگر عصر حاضر کا انسان دوبارہ وہ اخلاقی ذمہ داری اٹھا سکے گا جو جدید سائنس نے اس پر ڈال رکھی ہے تو صرف مذہب کی بدولت''۔(۱۵)

اسی خطبے میں آگے چل کر یہ بھی کہا:

''جب تک انسان کو اپنے آغاز و انجام یا دوسرے لفظوں میں اپنی ابتدا اور انتہا کی کوئی جھلک نظر نہیں آتی وہ کبھی اس معاشرے پر غالب نہیں آسکتا جس میں باہم دگر مقابلے اور مسابقت نے ایک بڑی غیر انسانی شکل اختیار کر رکھی ہے، نہ اس تہذیب و تمدن پر (غالب آسکتا ہے) جس کی روحانی وحدت اس کی مذہبی اور سیاسی قدروں کے اندرونی تصادم سے پارہ پارہ ہو چکی ہے''۔(۱۶)

ہمارے نزدیک ادب اور معاشرے کا مستقبل اسی روحانی وحدت کی بقا پر منحصر ہے۔

☆☆☆☆☆

حواشی

(1) When we consider the responsibility of intellectuals, our basic concern must be their role in the creation and analysis of ideology.

Noam Chomsky "The Responsibility of Intellectuals" ***New York Review of Books***, February 23, 1967

http://www.chomsky.info/articles/19670223.htm

(2) "The punishment varies, depending on the nature of the society. In Brezhnev's Russia, it could be exile or expulsion. In a typical US dependency like El Salvador, the miscreant might be left in pieces in a ditch after hideous torture, or have his brains blown out by US-trained elite battalions. In a Black ghetto in the US, punishment can be ugly-in one recent case, even Gestapo-style assassination of two Black organisers with the collaboration of the national political police; the facts are known and not denied, but considered a matter of no concern, given"

Noam Chomsky "Writers and Intellectual Responsibility Classics in Politics":
Powers and Prospects Reflections on Human Nature and the Social Order
London: Pluro Press 1988 p 96

(3) "Distinguished precedents include the huge indemnities imposed on Haiti in 1825 in punishment for the crime of having liberated itself from France, and the similar treatment of Indonesia by its longtime Dutch benefactors after it had committed the same crime. These are among the prerogatives of power, along with the lack of reaction to them. Still more remarkable is the fact that the Western stance inspires great acclaim, notably self-acclaim. The sordid spectacle is only made more vivid by the fact that the penalties for honesty and integrity are so slight, at least for people who enjoy the protections accorded to wealth and privilege in our free societies."

Powers and Prospects Reflections on Human Nature and the Social Order
p.103

(۴) ایڈورڈ سعید دانش وروں کا رول ترجمہ صدیق الرحمٰن قدوائی اسلم پرویز در نگار پاکستان کراچی بیاد ایڈورڈ سعید جون ۲۰۰۴ء شمارہ ۶ بحوالہ محمد خاور نوازش (مرتب) ادب زندگی اور سیاست (نظری مباحث) فیصل آباد: مثال پبلشرز ۲۰۱۲ء ص ۴۹۴

(۵) منشی پریم چند، ادب کی غرض و غایت (انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس ۱۹۳۶ء کا مکمل خطبہ صدارت) لاہور ماہنامہ سرخ چنار پلاٹینیم جوبلی خصوصی نمبر انجمن ترقی پسند مصنفین کے پچھتر سال ۔مرتبین رشید مصباح، آصف ۔اے شیخ، لاہور: فروری ۲۰۱۲ء ص ۶۴

(۶) اقبال، کلیاتِ اقبال فارسی، لاہور شیخ غلام علی اینڈ سنز ۱۹۹۰ء ص ۳۲۳

(۷) کلیاتِ اقبال فارسی ص ۳۱۸

(۸) منشی پریم چند، ادب کی غرض و غایت محولہ بالا ص ۶۷

(۹) کلیاتِ اقبال فارسی ص ۳۳۶

(۱۰) کلیاتِ اقبال فارسی ص ۳۱۸

(۱۱) منشی پریم چند محولہ بالا ص ۷۰

(۱۲) کلیاتِ اقبال فارسی ص ۳۴۴

(۱۳) ایضاً، جائے مذکور

(۱۴) اقبال، ''ہماری قومی زندگی'' در اقبال کے ملی افکار مرتبہ محمود عاصم لاہور: مکتبہ عالیہ ۱۹۷۷ء ص ۱۵۶

(۱۵) اقبال، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ مترجمہ سید نذیر نیازی لاہور: بزم اقبال ۱۹۸۶ء ص ۲۹۲

(۱۶) محولہ بالا، جائے مذکور منقولہ اردو اقتباس کا انگریزی متن ملاحظہ ہو:

"Both nationalism and atheistic socialism, at least in the present state of human adjustments, must draw upon the psychological forces of hate, suspicion, and resentment which tend to impoverish the soul of man and close up his hidden sources of spiritual energy. Neither the technique of medieval mysticism, nor nationalism, nor atheistic socialism can cure the ills of a despairing humanity. Surely the present moment is one of great crisis in the history of modern culture. The modern world stands in need of biological renewal. And religion, which in its higher manifestations is neither dogma, nor priesthood, nor ritual, can alone ethically prepare the modern man for the burden of the great responsibility which the advancement of modern science necessarily involves, and restore to him that attitude of faith which makes him capable of winning a personality here and retaining it hereafter. It is only by rising to a fresh vision of his origin and future, his whence and whither,

that man will eventually triumph over a society motivated by an inhuman competition, and a civilization which has lost its spiritual unity by its inner conflict of religious and political values."

Iqbal Allama Dr Muhammad ***The Reconstruction of Religious Thought in Islam*** ed M Saeed Sheikh Lahore: Institute of Islamic Culture 1989 p 149